بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلامی تاریخ و تمدن (۳)

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ

فردوسِ گم گشتہ

یعنی وہ بصیرت افروز مقالہ جو

جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویزؔ

نے

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

کے زیر اہتمام بتاریخ ۲۳ فروری ۱۹۴۱ء بمقام رامپور حامد ہال زیر صدارت

جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی (نائب صدر انجمن ہٰذا) نے پڑھا

اور بغرض افادۂ عام

محمد حامد اللہ انصاری معتمد نشر و اشاعت

نے

جید برقی پریس دہلی میں طبع کرا کر شائع کیا

بار اول

جلد ایک ہزار

۷۸۶

خدائے عزوجل کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ "اسلامی حکومت" اور "سائنس اور اسلام" کے بعد آج ہم اپنے سلسلۂ مطبوعات کا تیسرا نمبر "فردوسِ گم گشتہ" شایع کر رہے ہیں۔ "فردوسِ گم گشتہ" وہ بصیرت افروز اور جامع مقالہ ہے جو ہمارے محترم جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے ہماری انجمن کے زیرِ اہتمام ۲۳ فروری ۱۹۴۱ء کو پڑھا تھا۔

پرویز صاحب کی ذات گرامی علمی اور اسلامی حلقوں میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ اپنی ملازمت کی ذمہ داریوں اور غیر معمولی مصروفیت کے باوجود دینی و ملی سرگرمیوں میں ایک نمایاں حصّہ لیتے ہیں اور تقریباً چودہ سال سے قرآن حکیم کا عمیق مطالعہ فرما رہے ہیں۔ اور یہ امر ہماری لئے باعثِ مسرت ہے کہ آپ نہایت محنت و کاوش کے ساتھ ایک قرآنی انسائیکلو پیڈیا مرتب کر رہے ہیں آپ کو حق تعالیٰ جلّ شانہ نے قرآن کریم کی اعلےٰ بصیرت۔ ایک حساس طبیعت اور درد مند دل عطا فرمایا ہے۔

فردوسِ گم گشتہ آپ کے وسیع مطالعۂ قرآنی اور اسلامی علوم میں گہرے غور و خوض کے بیش بہا اور کثیر ثمرات میں سے ایک ہے۔ جو علوم قرآنی اور حقائق فرقانی کا نچوڑ ہے۔

اِس مضمون میں پرویز صاحب نے مسلمانوں کی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ کیونکر دولت و عزت، حشمت و عظمت اور ہمت و شجاعت کے اعلیٰ مدارج حاصل کر کے قعرِ مذلّت میں جا پڑے۔ اِس کا سبب محض صحیفۂ قرآنی کی پیروی کو ترک کر دینا ہے۔ جس پر عمل پیرا ہو کر قرونِ اولےٰ کے مسلمان تمام عالم میں اپنی عظمت و جبروت اور محاسن اخلاق و اعلےٰ خصائل کا سکہ بٹھا چکے تھے یہ ایک حقیقت ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد اگرچہ مسلمان ایک عرصہ تک ترقی و عروج کے منازل طے کرتے رہے۔ مگر وہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے ہٹتے رہے اور رفتہ رفتہ اپنے صحیح مسلک و راستہ کو بھلا کر ایسی راہ پر ہو لئے جو ان کے لئے کسی طرح مناسب نہ تھی

اور جو آخر کار ہلاکت اور تباہی کا باعث ہوئی جیسا کہ قرآن پاک میں نسلاً بعد نسل کے انحطاط کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔ فخلف من بعدہم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوات فسوف یلقون غیا۔ یہ آیت خواہ کسی موقعہ پر نازل ہوئی ہو مگر دورِ جدید کے مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ ان لوگوں کی معیشت و روزی ومن اعرض عن ذکری فان لہ معیشۃ ضنکا (جو اس کے ذکر اور احکام سے روگردانی کرتے ہیں) کے تحت تنگ کر دیتا اور ایسے لوگوں کو دنیا میں ذلیل و خوار کر کے وان تتولوا یستبدل قوماً غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم کے بموجب اُن پر دوسری قوم کو جو ان جیسی نہیں ہوتیں غالب اور مسلط کر دیتا ہے۔

پرویز صاحب نے ان تمام اسباب و علل پر نہایت آسان، پاکیزہ اور عام فہم پیرایہ میں آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے ایک سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ اور بعض بعض مقامات پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کلام سے مثالیں دیکر مضمون کو زیادہ حلاوت آمیز اور شیریں بنا دیا ہے۔

اس پیش نامہ میں مقالہ ہذا پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف مقالے اور صاحب مقالہ کو قارئین کرام سے روشناس کرا دینا ہے۔ ہمیں یہ محسوس کر کے بڑی مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مطبوعات کے کام میں ہمارے سرگرم نائب صدر جناب ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی اور انکے مربّی خاص اور ہمارے محبوب پرو وائس چانسلر پروفیسر ابوبکر احمد حلیم صاحب بجد دلچسپی لے لیتے ہیں اور یہ اُن ہی حضرات کی مخصوص توجہات اور سرپرستی کا نتیجہ ہے کہ ہم نے مطبوعات کے کام کو ایک وسیع پیمانہ پر جاری کرنیکا بیڑا اٹھایا ہے جسکا مقصد خالص تبلیغی ہوگا اور اس سے جو بہتر نتائج برآمد ہونگے اسکا سہرا ان ہی دونوں حضرات کے سر ہوگا۔

اس سلسلے میں یہ عرض کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ ہم اپنی مطبوعات کے اس پیش نظر تیسرے نمبر کے بعد اس سال حسب ذیل اہم تقاریر و مقالات اور شائع کرنیکا قصد رکھتے ہیں۔ اگر تائید ایزدی اور قارئین کرام کی سرپرستی شامل حال ہے تو ہم ضرور اس مقصد میں کامیاب ہونگے۔

(۴) "ایمان" علامہ سید سلیمان ندوی صاحب (۵) "اسلامی تمدن" الحاج مولانا قاری محمد طیب صاحب۔
(۶) "اسلام کا پیغام بیسویں صدی کے نام" مولانا عبدالماجد دریابادی (۷) "ضرورتِ ہادی و ختم نبوت" حافظ کفایت حسین صاحب

آخر میں ہم اسے اپنا خوشگوار فرض سمجھتے ہیں کہ جناب ناظم صاحب ادارہ طلوع اسلام کا تہِ دل سے شکریہ ادا کریں جنھوں نے پیشِ نظر مقالہ کی طباعت کی ذمہ داری اپنے سر لیکر ہمیں اس بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔

انجمن اسلامی تاریخ و تمدن
مسلم یونیورسٹی علیگڈھ۔ ۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۸ھ

حامد اللہ انصاری عفی عنہ
معتمد نشر و اشاعت

فردوسِ گم گشتہ

[۲۲/۲۳ فروری کو مجلسِ تاریخ و تمدن کی دعوت پر دارالعلوم علی گڈھ جانیکا اتفاق ہوا۔ وقت بہت کم تھا اور مشاغل پیشِ نظر بہت زیادہ۔ بایں ہمہ ایک تیرتی ہوئی نگاہ سے جو کچھ وہاں دیکھ سکا، اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ قوم کے نوجوانوں میں قرآنِ کریم کی طرف ایک خاص رجحان پیدا ہو رہا ہے اور اگر انھیں قرآن کی صحیح تعلیم سے روشناس کرا دیا جائے۔ تو اُن کے ساتھ بہت سی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ طلبا اور حضراتِ اساتذہ کے اجتماع میں پڑھا گیا۔ اس میں کئی ایک چیزیں ایسی بھی ملیں گی جو اس سے پیشتر طلوعِ اسلام میں شایع شدہ مضامین میں آپکی نظر سے گذر چکی ہونگی۔ لیکن اس مقالہ میں ان چیزوں کو اس انداز سے ترتیب دیا گیا ہے کہ اس ربط و نظم سے مسئلہ زیرِ نظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے، اس لئے اس کا مطالعہ کسی کے لئے بھی نفع سے خالی نہ ہوگا۔]

نوجوان طالب علموں کی لاابالانہ بیباکیاں عام طور پر مشہور ہوتی ہیں۔ لیکن دارالعلوم علی گڈھ کے طلباء نے جس جذبِ انہماک اور سکون و سکوت سے اس مقالہ (اور میری دوسرے وقت کی تقریر و مذاکرہ) کو سُنا۔ اور مختلف موضوعات پر سوال کیے۔ اس نے ان کی ذہنی و قلبی تعمیر کے متعلق میرے دل پر نہایت عمدہ اثر چھوڑا۔ میں طلبا اور ان کے ذمہ دار اصحاب اساتذہ کو اس باب میں درخورِ تحسین و تبریک سمجھتا ہوں اور اربابِ مجلس تاریخ و تمدن کا شکرگذار ہوں کہ انھوں نے اس امر کا نہایت عمدہ انتظام کیا کہ میں اپنے خیالات ان نونہالانِ ملت تک پہونچا سکوں جو قوم کے مستقبل کے مظہر اور حضرت علامہ اقبال کی ان دعاؤں کے

محور ہیں۔

جوانوں کو میری آہِ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نورِ بصیرت عام کر دے

{ پرویز }

کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے ماتحت سرگرمِ عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ریت کے ذرہ سے لیکر عظیم الشان کرۂ ارض تک۔ اس کرہ سے کئی لاکھ گنا بڑا سورج مع اپنے محیر العقول نظام کے۔ اور پھر اس نظامِ شمسی جیسے لاتعداد اور نظامِ اجرامِ سماوی سب ایک متعینہ قاعدہ کے مطابق اپنے اپنے فرائض مفوضہ کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ اگر زمین اپنے راستہ سے کبھی ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی کرلے۔ اگر ہوائیں اپنے رُخ کو طرفۃ العین کیلئے خلاف قاعدہ بدل لیں۔ اگر پانی اپنی فطرت کیخلاف نشیب کی بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے غرضیکہ اس مشنری کا کوئی ایک پرزہ اپنے نظام سے سرتابی اختیار کرلے تو یہ عظیم الشان کائنات ایک سیکنڈ میں درہم برہم ہو جائے اور یہ تحیّر انگیز کارگہ حیات مٹی کا گھروندا بن کر رہ جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں۔ دنیا اور اس کی تمام نُدرت آفرینیاں محض اس بناء پر قائم ہیں کہ فطرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ اس حیرت خانۂ امروز و فردا کا ہر ایک پرزہ اپنے دائرہ عمل میں پوری مستعدی سے اطاعت کوش ہے وَلِلّٰهِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۔ ہر شے اس کے احکام کے سامنے سجدہ ریز ہے. كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ

ذرہ ذرہ دہر کا زندانیٔ تقدیر ہے

جب عالمِ موجودات کی ہر شے اس محکم اور غیر متبدل قانون پر عمل پیرا ہے تو کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ جو نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے وہ اس قانون سے مستثنےٰ ہوگا؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ بزمِ سخن میں ہر شعر عروض و قوافی کی حدود و قیود سے گھرا ہوا ہو۔ لیکن حاصلِ مشاعرہ

ربط و ضبط کی ان پابندیوں سے آزاد ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ بیج سے لیکر کونپل تک درخت کا ایک ایک حصہ اپنی زندگی کے ہر مرحلہ میں قاعدے اور قانون کا پابند ہو۔ لیکن پھل ہر اصول سے بے نیاز ہو! ایسا نہیں ہو سکتا۔ جب کائنات کی ہر شے ایک خاص نہج اور اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو انسان کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص قانون کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ قانونِ حیات جس کے مطابق انسان کیلئے زندگی بسر کرنا تقاضائے فطرت ہے، اسلام کہلاتا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ط (۳۰/۳۰)
خدا کا وہ قانونِ فطرت جس کے مطابق اُسنے نوعِ انسانی کو پیدا کیا۔ اللہ کی خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی دینِ محکم ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس (حقیقت) کو نہیں جانتے۔

لیکن انسان اور فطرت کی دوسری چیزوں میں ایک بیّن فرق ہے۔ دیگر اشیائے فطرت اس قانون کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں جو ان کے لئے متعین کیا گیا ہے انھیں اس قانون کی تعمیل و عدم تعمیل میں کوئی اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا۔ اُنھیں جو حکم دیا گیا ہے اسمیں انھیں مجالِ سرتابی نہیں یارائے سرکشی نہیں۔ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ لیکن برعکس اسکے انسان کو اس معاملہ میں اختیار و ارادہ بھی دیا گیا ہے، اُسے آزادی حاصل ہے کہ وہ چاہے تو فطرت کے اس متعیّنہ ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے تو اُسکی خلاف ورزی کرے۔ اسے زندگی کے دوراہے پر کھڑا کر دیا گیا ہے جہاں نہایت جلی حروف میں سائن پوسٹ نصب ہیں۔ سامنے عقل و فکر اور شعور و ادراک کی شمعیں فروزاں ہیں جنکی روشنی میں یہ سائن پوسٹ کو پڑھ کر دونوں راستوں میں تمیز کر سکتا ہے اسکے بعد اُسے اختیار دیا گیا ہے کہ یہ جس راہ پر چاہے گامزن ہو جائے۔ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ط

اختیار و ارادہ کا یہی امتیاز ہے جس سے انسان دیگر مخلوق کائنات کے مقابلہ میں اشرف و اعلیٰ ہے۔ یہی قوتِ تمیز اسکی سرفرازی و بلندی کا باعث ہے۔ اسی سے یہ مسجودِ ملائک مخدومِ خلائق ہے۔ کشمکشِ حیات میں پرکیف جاذبیتیں ہیں تو اسی سے اور کشاکشِ زندگی میں رنگین کیفیتیں ہیں تو اسی کے دم سے۔ بربطِ ہستی کے تاروں میں خوابیدہ نغمتیں بیدار ہوتے ہیں تو اسی مضراب سے۔ اور جامِ زندگی کے سادہ پانی میں کیفِ تنگ تعطر کی ارغوانی موجیں اُٹھتی ہیں تو اسی کے جوش سے۔ سینۂ کائنات میں ایک دھڑکنے والا دل ہے تو اسی کے تموج سے اور اگر اس دل میں مچلنے والی آرزوؤں کی رسیلی بجلیاں ہیں تو اسی کے تحرک سے۔ غرضیکہ انسان، انسان ہی تو اسی کی بدولت۔ اور یہ دُنیا، دُنیا ہے تو اسی کے صدقے۔ اگر یہ اختیار

داارادہ نہ ہوتا تو انسان پتھر کا بت ہوتا۔ یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ۔ مسجودِ ملائک اور مسخرِ کائنات
کبھی نہ ہوتا۔ قصۂ آدم کا پہلا باب اسی اختیار و ارادہ کے مظاہرہ سے شروع ہوتا ہے جو معصیتِ آدم کی
شکل میں سامنے آتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جو بدی کی قدرت رکھتے ہوئے عمل میں آئے۔ اطاعت وہی طاعت
جو سرکشی کی استطاعت کے باوجود سرزد ہو۔ نیازمندی اسی کی قابلِ ستائش ہے جو خود سراپا ناز ہو
اُسی کے سر کے جھکنے میں لذت ہے۔ جس کی پیشانی میں دنیا بھر کی سرفرازیاں جھلک رہی ہوں۔ جس میں
انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام
کرنا خوئے غلامی ہے۔ جس کے پاؤں کے نیچے تختِ حکومت نہیں اس کا بوریہ نشین ہونا گداگری
اختیار میں جبر ہی انسانیت کا شرف اعتبار ہے۔ اسی سے اس کی خودی میں استحکام پیدا
ہوتا ہے اور استحکام خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔ لیکن یہی اختیار و ارادہ اگر آئین و ضوابط کے
سانچوں میں پابند نہ ہو جن کے اندر رہتے ہوئے زندگی بسر کرنا تقاضائے فطرت ہے۔ تو اس دیو بے زنجیر
کی حدود فراموش و قیود ناآشنا سیلاب انگیزیوں کا کیا ٹھکانا! بھلا سوچئے کہ جو انسان کائنات
کی ہر شے کو تابع فرمان کر لینے کی امکانی قوتیں اپنے اندر رکھتا ہو۔ وہ اگر اپنی قوتوں کو آزاد چھوڑ دے
تو دنیا کیسی ہولناک بربادیوں کا عبرت انگیز مرقع بن جائیگی!

یہی وہ خلافِ فطرت آزادی تھی جس نے یورپ کے ان میدانوں کو جن کا ہر گوشہ کل تک دامانِ باغبان
و کفِ گلفروش کا حسین نظارہ در آغوش تھا، آج آگ اور خون کا ایسا جہنم بنا دیا ہے۔ جس میں انسانیت
تڑپتی، پھڑکتی، جھلستی، بلبلاتی سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہی ہے۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لئے کہ یورپ
نے اختیار و ارادہ کو ابلیسانہ سرکشی تو سکھا دی۔ لیکن ؎

عقل کو تابع فرمانِ نظر کر نہ سکا

جس کا عملی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا — اقبالؔ

یہ آئین و ضوابط جن کے ماتحت زندگی بسر کرنا فطرتِ انسانیت ہے۔ وحی خداوندی کے باہر
کہیں نہیں مل سکتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جب یہ آئین و ضوابط عین فطرت ہیں۔ تو انھیں کسی خارجی ذریعہ
سے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے لئے فطرتِ انسانی کی آواز ہی کافی ہو سکتی تھی۔ یہ درست
ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انسان کی فطرت، پتھر کی فطرت نہیں جس پر کوئی خارجی اثر انداز نہ

ہو سکے۔ جسے آپ آج انسانی فطرت کہتے ہیں ذرا پوچھئے علم تجزیہ نفس (PSYCHO-ANALYSIS) کے ماہرین سے کہ اس کی کیفیت کیا ہے اور یہ کن خارجی اثرات و رجحانات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ وراثت کے اثرات، ماحول کے اثرات، بچپن کی تعلیم و تربیت کے اثرات۔ قومی روایات کے اثرات۔ اور پھر آگے بڑھیئے تو ان اخلاط کے اثرات جن سے جسم انسانی ترکیب پاتا ہے۔ ان تمام اثرات کے بعد اندازہ فرمائیے کہ صحیح فطرت کی آواز کہاں باقی رہ سکتی ہے، ان اثرات کا تو یہ عالم ہے کہ طبعی ضروریات میں بھی فطرت صحیح راہ نمائی نہیں کر سکتی مثلاً ایک بکری کا بچہ بھوکوں مر جائیگا لیکن کبھی گوشت کیطرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیگا۔ ایک مرغی کے بچہ پر ہزار آفت آ رہی ہو وہ پناہ جوئی کیلئے پانی کے حوض کی طرف ایک قدم بھی نہیں اٹھائیگا۔ لیکن انسان کا بچہ، سنکھیا کے ٹکڑے کو بھی اسیطرح بلا تکلف منہ میں ڈال لے گا جس طرح شکر کی ڈلی کو۔ وہ بلا تامل آگ میں ہاتھ ڈال دے گا۔ پانی کے حوض کی طرف لپک کر جائیگا۔ آپ کو قدم قدم پر اسکی حفاظت کرنی پڑیگی۔ سو جس متاثر فطرت کی آواز کا یہ عالم ہو کہ حیوانی ضروریات میں بھی راہ نمائی نہ کر سکے۔ اسے انسانی ضروریات کیلئے کافی سمجھ لینا وہی نتائج پیدا کرے گا۔ جو آج یورپ میں ہو رہے ہیں۔ انسان کی راہ نمائی صرف اس مقام سے ہو سکتی ہے جو ان تمام خارجی اثرات سے بلند و بالا ہو۔ اور اس کا تعین وہی ذات کر سکتی ہے جو انسانی جذبات و رجحانات اور امیال و عواطف سے منزہ و مبرا ہو۔ یہ مقام مقام وحی۔ اور یہ ذات ذات خداوندی ہے۔ وہ ذات جسے انسانی فطرت کے خلاق ہونے کی حیثیت سے خوب معلوم ہے۔ کہ کس قسم کے آئین و ضوابط فطرت صحیحہ کے مطابق ہیں اور کن چیزوں سے اسے روکنے کی ضرورت ہے۔ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى (۲۰:۵۰) اس لئے انسان کو جب اس عالم اثرات و جذبات میں بھیجا گیا کشمکش حیات اس کے لئے مقدر کی گئی۔ تو ساتھ ہی یہ انتظام بھی کر دیا کہ اس کی فطرت کی صحیح راہ نمائی کے لئے آسمانی ہدایت بھی اسے ملتی رہے۔ اور اس سے کھلے کھلے الفاظ میں کہدیا گیا کہ اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرتے رہو گے تو تمہیں کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہو گا۔

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ

پھر انسان اور دیگر مخلوق کے اسلوب زندگی میں ایک نمایاں فرق اور بھی ہے۔ باقی

مخلوق کی زندگی انفرادی ہے، ایک کے اعمال کا دوسرے پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ ایک کو دوسرے سے کچھ لمبا چوڑا واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن انسان مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ اسے مل جل کر زندگی بسر کرنا ہے، اُن کے مقاصد مشترک ہیں۔ ان کے معاملات باہمد گر پیوست ہیں۔ یہاں ایک کے اعمال سے قوم کی قوم اثر پذیر ہو جاتی ہے۔ اگر ایک مستبد قوت بر سر اقتدار آجائے تو کروڑوں انسانوں پر جہنم کا عذاب مسلط ہو جاتا ہے اور اگر اس کے خلاف ان کے مقدرات کسی صاحب عدل و انصاف کے ہاتھ میں آجائیں۔ تو یہی جہنم جنت سے بدل جاتی ہے۔ یہاں ایک بد اخلاق، دق کے جراثیم کی طرح پوری کی پوری سوسائٹی کو ہلاکت و بربادی کے مہیب غار میں دھکیل سکتا ہے۔ اور ایک خوش اطوار، نرگس و لالہ کی طرح ساری محفل کو جہانِ رنگ و بو میں تبدیل کر سکتا ہے۔ یہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہزاروں زیر دست انسانوں کے خون کی رنگینی۔ کسی ایک بالا دست کے عشرت کدہ کی زیبائش و آرائش کے کام میں لائی جائے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی ایک کی قوتِ بازو لاکھوں کی بھوک کی کفیل ہو جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی ایک کی ہوسِ ستم رانی سے ہزاروں بے گناہ سینے گولیوں کا نشانہ بن جائیں۔ اور یہ بھی امکان میں ہے کہ کسی ایک کی سپر لاکھوں مظلوموں کے لئے کاشانۂ امن بن جائے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات کے ماتحت۔ قانونِ فطرت صرف وہی ضابطۂ حیات ہو سکتا ہے جس کا دائرۂ عمل افراد تک ہی محدود نہ ہو بلکہ اس کے پیشِ نظر حیاتِ اجتماعیہ انسانیہ کی اصلاح ہو۔ بلکہ یوں کہئے کہ وہ افراد کی اصلاح بھی اس لئے کرے کہ ان کے مجموعہ سے جو سوسائٹی متشکل ہوگی۔ وہ از خود اصلاح یافتہ ہو جائے گی۔ وہ مختلف پرزوں کا جائزہ لے، ان کے نقائص کو دور کرے تاکہ ان کے نظم و نسق اور تدوین و ترتیب سے جو مشین تیار ہو وہ از خود اصلح و اعلےٰ ہو۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب اس قدر خارجی اثرات اور آہنی مخالف قوتیں انسان کی فطرتِ صحیحہ کے راستے میں حائل ہیں تو انسانوں کی ہدایت کے لئے محض ایک ضابطۂ قوانین ہی کافی نہ ہوگا۔ بلکہ اس قانون کو نافذ کرنے کیلئے قوت بھی درکار ہوگی۔ کہ قانون بلا قوتِ نافذہ ایک عام کتاب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ تعزیراتِ ہند۔ ہندوستان کے اندر ایک زندہ قانون ہے۔ اسلئے کہ اس کے پیچھے ایک قوتِ نافذہ موجود ہے۔ لیکن یہی ضابطۂ قوانین۔ سرحد کے آزاد قبائل میں ایک عام کتاب ہے۔ کہ وہ علاقہ اس قوتِ نافذہ کے احاطہ سے

باہر ہے۔ اس لئے قانون وہی زندہ کہلا سکتا ہے۔ جس کے ساتھ قوت نافذہ بھی موجود ہو۔

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد — اقبالؒ

لہٰذا جس خلاقِ فطرت نے انسانی رشد و ہدایت کے لئے ضابطۂ قوانین عطا فرمایا۔ اس نے یہ بھی ارشاد فرما دیا کہ اس قانون کی تنفیذ و ترویج کے لئے قوت کی بھی ضرورت ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ

یقیناً ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایت دے کر بھیجا۔ اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین (کتاب) اور میزان عدل نازل کی۔ تاکہ نوعِ انسانی توازن پر قائم رہے۔ اور ہم نے ان چیزوں کی محافظت کے لئے فولاد کی شمشیر بھی نازل کی۔ جس میں شدت کی سختی ہوتی ہے۔ اور لوگوں کے لئے منفعت تاکہ اللہ یہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی غائبانہ مدد کرتا ہے۔ یقیناً اللہ صاحبِ قدرت و تدبیر ہے

اس ضابطۂ قوانین کا نام ہے ہدایتِ خداوندی۔ اور اس قوتِ نافذہ کا نام ہے حکومتِ الٰہی۔ یہ بحث تفصیل طلب ہے کہ انسانوں کو کس حد تک اختیار ہوگا کہ وہ اس قانون کے تابع چلیں اور کس حد تک اسکی اتباع لازمی ہوگی۔ مجملاً یوں سمجھئے کہ اس ضابطۂ حیاتِ اجتماعیہ کی رو سے انسان دو جماعتوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر بن جائیں۔ جو دنیا میں قوانینِ خداوندی کے نفاذ کی ذمہ دار ہے اور دوسرے گروہ جو اس کے ممبر نہ ہوں۔ آپ ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اسکے قوانین و ضوابط مرتب کرتے ہیں اب ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے قواعد و ضوابط کا بغور مطالعہ کرے۔ اور اس کے بعد جی چاہے تو اس سوسائٹی کی ممبری (رکنیت) قبول کرلے اور جی چاہے تو نہ کرے۔ اسپہ کوئی جبر نہیں۔ لیکن جب آپ اس کی رکنیت قبول کرلیتے ہیں تو اس کے بعد آپ

پر لازم ہوجاتا ہے کہ اس سوسائٹی کے تمام قواعد وضوابط کی اتباع کریں۔ آپ کو یہ اختیار کبھی نہیں دیا جا سکتا کہ جس قاعدہ کی جی چاہے اتباع کریں اور جس کی جی چاہے مخالفت کریں۔ جب تک آپ اس سوسائٹی کے ممبر ہیں۔ آپ کو تمام وکمال قواعد وضوابط کی اطاعت کرنی ہوگی۔ اگر آپ ایسا نہیں کرنا چاہتے تو رکنیت سے مستعفی ہوجائیے۔ اب رہے وہ جو اس سوسائٹی کے ممبر نہیں ہیں سوان پر ان قواعد وضوابط کا تمام وکمال اطلاق نہیں ہوگا۔ لیکن چونکہ یہ مجموعہ قوانین حیات اجتماعیہ انسانیہ کی اصلاح کے لئے مرتب کیا گیا ہے اس لئے جن امور کا تعلق عام انسانیت سے ہے ان سے متعلقہ قوانین کا اطلاق ان پر بھی ہوگا۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک سوسائٹی تپ دق کی روک تھام کے لئے متشکل ہوتی ہے کچھ قواعد وضوابط تو ایسے ہوں گے جن کا اطلاق صرف اس سوسائٹی کے اراکین پر ہوگا۔ لیکن اس مرض سے متعلقہ امور کے حصہ قوانین کا اطلاق ممبر اور غیر ممبر دونوں پر ہوگا دق کے جراثیم جہاں کہیں بھی معلوم ہونگے ان کے استیصال کے لئے ان ضوابط کے ماتحت ضروری کارروائی کی جائے گی۔ اور ان قوانین کا نفاذ کبھی جبر نہیں کہلائے گا۔ یہ ایسا ہی جبر ہے جیسا ایک ڈاکٹر کسی مریض پر آپریشن کر کے "زبردستی" کرتا ہے۔ اسے کوئی صحیح العقل زبردستی نہیں کہہ سکتا۔ اگر کسی اندھے کو کنوئیں میں گرنے سے زبردستی روک لینا اس پر زیادتی نہیں۔ کسی بچے کے ہاتھ سے بجبر چاقو چھین لینا اس پر ظلم نہیں۔ کسی خودکشی کرنے والے کو گرفتار کر کے اس کے اس اختیار کو اس سے سلب کر لینا ناانصافی نہیں۔ تو عام انسانوں کی مسخ شدہ فطرت کو راہ راست پر چلانے کیلئے قوانین صحیحہ کا نفاذ بھی جور وتعدی نہیں کہلا سکتا۔ بالخصوص اسلئے کہ فطرت صحیحہ کی خلاف ورزی کے "نتائج" قوانین طبعی کی طرح ایسے محسوس اور بدیہی نہیں ہوتے کہ انسان ان سے از خود اجتناب کرنے لگ جائے۔ مثلاً انسان کی زندگی کا مدار سانس پر ہے، ذرا اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے منہ اور ناک بند کر لیجئے خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ اس معصیت کوشی کا نتیجہ کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان جھوٹ بولتا ہے تو حالانکہ یہ بھی اسیطرح خلاف قانون فطرت ہے۔ جس طرح سانس روک لینا۔ لیکن اس معصیت کا نتیجہ محسوس طور پر اس کے سامنے نہیں آتا۔ وہ اس سے تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ لیکن یہ توظاہر ہے کہ وہ محسوس کرے یا نہ کرے اس کا نتیجہ تو مرتب ہو کر رہیگا۔ یہی وہ نتائج ہیں جن کا مجموعی اثر غیر محسوس طور پر انسان کی تمدنی۔ عمرانی۔ معاشی

معاشرتی۔ اخلاقی۔ سیاسی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کو متأثر کر
رفتہ رفتہ انسان کی حیات اجتماعیہ کو اسی قالب میں ڈھال دیتا ہے
تقاضائے عدل وانصاف یہی ہے کہ انسانوں کو اس معصیت کوشی سے روکا جا
اثرات اس قدر دوررس اور عالمگیر ہوں، یہ انسان کے اختیارات کو کچل
بلکہ دراصل اس کی خواہشات کی تحدید ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ نظام انسانیت
ہی قائم رہ سکتا ہے اگر کسی کا پاؤں زہر آلود ہوجائے تو اس کی پنڈلی کو ایسا
دیا جاتا ہے جس سے اوپر کا حصّہ اس زہر کے اثر سے فی الجملہ محفوظ ہوجائے۔ ا
دیکھے کہ زہر کا اثر اس سے بھی نہیں رُکتا اور اندیشہ ہے کہ اس سے رفتہ
حصّۂ جسم بھی متأثر ہوجائے گا تو وہ جسم انسانی کے کلی منافع کی خاطر پاؤں کا
یہی وہ تحدید وتادیب ہے۔ جس سے حیاتِ اجتماعیۂ انسانیہ خلافِ فطرت
زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے اور یہ تحدید اُسی صورت میں ممکن
کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو۔ اس قوتِ نافذہ کی اطاعت کسی غیب
بلکہ نفس انسانی کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہوگی۔ یہ کسی انسان کے سامنے جھکا
کہ جس سے انسانی خودی کا آئینہ چکنا چور ہوجاتا ہے۔ بلکہ قوانین الہیّہ کی اطاع
سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔

جبر واطاعت کی اس لِم کو پیشِ نظر رکھئے اور اس کے بعد دیکھئے ک
انسانیت کا یہ نظام کس انداز سے قائم کیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ا
کا سلسلہ قائم کیا۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ التزام بھی فرما دیا کہ جس جماعت سے
کے قوانین کا نفاذ ہوا۔ انھیں خلافتِ ارضی سے بھی سرفراز کیا جائے تاکہ اس ضابطۂ
زندہ قوت کی حیثیت حاصل ہو۔ یہ محض نظری مسائل کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ قو
محافظ ہو اور قانونِ خداوندی اس قوت پر ایسا ضبط اور (CONTROL) رکھے کہ یہ کہیں نا جا
قرآن اور قوت نہ صرف لازم اور ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کے محافظ بھی ہ

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند　　　　کائناتِ زندگی را محور اند

اگر آپ قرآنی حقائق پر غور فرمائیں تو یہ حقیقت واضح ہوجائے گی
حی وقیوم کا وہ ازلی پیغام جو حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا

معاشرتی۔ اخلاقی۔ سیاسی غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی کو متأثر کر دیتا ہے۔ اور رفتہ رفتہ انسان کی حیات اجتماعیہ کو اسی قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ اس لئے تقاضائے عدل و انصاف یہی ہے کہ انسان کو اس معصیت کوشی سے روکا جائے۔ جس کے اثرات اس قدر دوررس اور عالمگیر ہوں، یہ انسان کے اختیارات کو کچل دینا نہیں ہوگا بلکہ دراصل اس کی خواہشات کی تحدید ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ نظام انسانیت تحدید سے ہی قائم رہ سکتا ہے اگر کسی کا پاؤں زہر آلود ہو جائے تو اس کی پنڈلی کو ایسا کس کر باندھ دیا جاتا ہے جس سے اوپر کا حصہ اس زہر کے اثر سے فی الجملہ محفوظ ہو جائے۔ اور اگر ڈاکٹر دیکھے کہ زہر کا اثر اس سے بھی نہیں رُکتا اور اندیشہ ہے کہ اس سے رفتہ رفتہ باقی حصۂ جسم بھی متأثر ہو جائے گا تو وہ جسم انسانی کے کلی منافع کی خاطر پاؤں کاٹ ڈالتا ہے۔ یہی وہ تحدید و تادیب ہے۔ جس سے حیات اجتماعیہ انسانیہ خلافِ فطرت اعمال کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکتی ہے اور یہ تحدید اُسی صورت میں ممکن ہے کہ قانون کے ساتھ قوتِ نافذہ بھی موجود ہو۔ اس قوتِ نافذہ کی اطاعت کسی غیر کی غلامی نہیں بلکہ نفس انسانی کے اعلیٰ ترین رجحانات کی اطاعت ہوگی۔ یہ کسی انسان کے سامنے جھکنا نہیں ہوگا۔ کہ جس سے انسانی خودی کا آئینہ چکنا چور ہو جاتا ہے۔ بلکہ قوانین الٰہیّہ کی اطاعت ہوگی جس سے خودی کا استحکام ہوتا ہے۔

جبر و اطاعت کی اس لِم کو پیش نظر رکھئے اور اس کے بعد دیکھئے کہ اصلاحِ انسانیت کا یہ نظام کس انداز سے قائم کیا گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں رشد و ہدایت کا سلسلہ قائم کیا۔ تو اس کے ساتھ ہی یہ التزام بھی فرما دیا کہ جس جماعت کے ہاتھوں اس کے قوانین کا نفاذ ہو۔ انھیں خلافتِ ارضی سے بھی سرفراز کیا جائے تاکہ اس ضابطۂ الٰہی کو ایک زندہ قوت کی حیثیت حاصل ہو۔ یہ محض نظری مسائل کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ قوت اس قانون کی محافظ ہو اور قانونِ خداوندی اس قوت پر ایسا ضبط اور (CONTROL) رکھے کہ یہ کہیں ناجائز استعمال نہ ہوسکے قرآن اور قوت نہ صرف لازم اور ملزوم ہیں بلکہ ایک دوسرے کے محافظ بھی ہیں

این دو قوت حافظِ یک دیگراند   کائناتِ زندگی را محورند   اقبالؒ

اگر آپ قرآنی حقائق پر غور فرمائیں تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ خدائے حی و قیوم کا وہ ازلی پیغام جو حضرات مامورین من اللہ کی وساطت سے دنیا میں آتا رہا۔

اس باب میں اس کا شروع سے ایک ہی اسلوب اور ایک ہی لم رہی یعنی وہ ان عیوب ونقائص کو دُور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جو دولت وقوت کی زیادتی اور ان کے غلط استعمال سے انسانوں میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسری طرف ضعیف وناتواں لوگوں کو اُبھار کر انسانیت کی بلند ترین سطح پر لاتے رہے اور اس کے ساتھ ہی اُنھیں ایسی حیات پرور تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ جس پر عمل پیرا ہونے سے ان میں وہ عیوب پیدا نہ ہوں جو قوت کے غلط استعمال سے لازمی طور پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ قوانین الٰہیہ سے منہ موڑنے والے انسانوں سے دنیا چھین کر ان کمزوروں کو دیتے تھے۔ اور اس کے ساتھ انھیں وہ ضابطۂ حیات عطا کرتے تھے جس سے ان کے اور اُن کے خدا کے درمیان ایک دائمی رشتہ قائم رہے اور وہ یوں زمین وآسمان کی بادشاہت کے وارث بنتے چلے جائیں۔ بس یہ ہے خلاصہ اس تعلیم فطرت کا جو انسانوں کی ہدایت کیلئے زمین پر بھیجی جاتی رہی اور اسی پر عمل پیرا ہونیکا نام دنیا کی فلاح اور عاقبت کی سرخروئی ہے۔ میزانِ خداوندی کے یہ دو پلڑے ہیں جن میں ہمیشہ توازن رہنا چاہئے۔ نظامِ انسانیت کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں جو ہمیشہ ہموار اور استوار ہونے چاہئیں۔ آزادوں کی فضائے بسیط میں اُڑنے والے شاہین کے دو بازو ہیں کہ جن میں سے اگر ایک بھی کمزور ہو گیا تو وہ زمین سے نہیں اُبھر سکتا۔ اور اگر دونوں کی قوت بڑھتی چلی گئی تو اس کی پرواز کی حدیں وہ ہیں جہاں پہنچنے سے قدسیوں کے بھی پر جلتے ہیں قرآن کریم میں حضرت انبیاء کرامؑ اور اُمم سابقہ کے احوال وکوائف پر نگاہ ڈالئے۔ یہ حقیقت اُبھر کر سامنے آجائیگی۔ ایک سورہ اعراف کو ہی دیکھئے۔ حضرت نوحؑ کے بعد جہاں حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السّلام کے سلسلۂ رشد وہدایت کا ذکر ہے وہاں اُن کی اقوام کے متعلق بہ صراحت موجود ہے کہ اُنھیں سطوت واقتدار اور حکومت وقوت کی نعمتوں سے بھی سرفراز کیا گیا تھا۔ سلسلۂ انبیاء کرام میں حضرت ابراہیمؑ کا گھرانہ خاص طور پر ممتاز ہے۔ اس مقدس گھرانہ کے متعلق تصریحاً فرمایا کہ اُنھیں کتاب وحکمت کے ساتھ "ملکِ عظیم" بھی عطا فرمایا گیا تھا۔ حضرت یوسفؑ کے تمکن فی الارض کا حیات پرور تذکرہ احسن القصص کے تابندہ عنوان سے قرآن کریم کے صفحات پر جگمگاتا نظر آتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور بنی اسرائیل کی تو تمام داستان۔ اسی قوت وحشمت اور تمکن اور تسلط کی مسلسل تاریخ ہے۔ لیکن یہ تمام سلسلہ کچھ اس انداز سے جاری تھا کہ حضرت انبیاء کرامؑ خاص

وقت اور خاص اقوام کے لئے تشریف لاتے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان کا پیغام یا تو بھلا دیا جاتا۔ یا اس میں الحاق و تحریف کر دی جاتی۔ پھر اس کے بعد ایک نئے ایڈیشن کی ضرورت پڑ جاتی یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ دنیا اپنے عہدِ شعور کو پہنچ گئی۔ انسانیت پر شباب آ گیا۔ اب وہ وقت تھا کہ انسانوں کو ایک مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جاتا۔ جو ان کی قیامت تک کی ضروریات کے لئے اکتفا کرتا۔ اور اس ضابطۂ قوانین کو محفوظ و مصئون رکھا جاتا۔ یہ ضابطۂ قوانین ملا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی حامل جماعت کو ایسی سطوت و اقتدار کی زندگی عطا ہوئی کہ جس کی مثال اُمم سابقہ میں کہیں نہیں ملتی۔ قدوسیوں کی اس جماعت کے ہاتھوں خدا کی حکومت کا تختِ اجلال اس زمین پر بچھایا گیا۔ اور ان تمام غیر فطری بندشوں کے طوق و سلاسل توڑ دیئے گئے۔ جن کے نیچے انسانیت صدیوں سے دبی چلی آتی تھی۔ یہی مشیّت کا منشا تھا۔ یہی پیغام خداوندی کا مقصود تھا۔ یہی انسانیت کی معراج تھی۔ اس تکمیل نعمت اور اتمامِ دین کے بعد نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نبوت ختم ہو جانے کے بعد اس نظام کو آگے چلانے کی کیا صورت اختیار کی گئی۔ جواب تک حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے چلایا جا رہا تھا۔ فرمایا

ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا ۳۵/۳۲

پھر ہم نے اس کتاب کی وراثت کیلئے اپنی بندوں میں سے ایک جماعت کو منتخب کرلیا

اور وراثت کتاب کے ساتھ ساتھ انھیں حکومت و مملکت کا بھی وارث بنا دیا۔ سورۂ احزاب میں ہے کہ اس نے تمہیں (حق کے دشمنوں کی) زمینوں کا اور ان کے شہروں کا اور ان کے اموال کا مالک بنا دیا۔ اور ان زمینوں کا بھی جہاں ابھی تمہارے قدم نہ پہونچے تھے۔" اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی تصریح فرما دی کہ یہ کوئی محض اتفاقی امر نہ تھا جو تمہیں یہ شوکت و سطوت مل گئی۔ بلکہ یہ ہمارا ٹھہرایا ہوا قاعدہ ہے۔ یہ فطرت کا غیر متبدل قانون ہے۔ سورۂ نور میں ہے کہ" جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور اعمالِ صالحہ کریں۔ اللہ نے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں اس زمین کی حکومت عطا فرمائے گا جس طرح ان سے پیشتر اس

نے (ان شرائط کو پورا کرنے والوں کو) حکومت عطا فرمائی تھی۔ اور ان کے اِس دین کو جو ان کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ متمکن کر دے گا۔ اور ان کا خوف امن سے بدل دے گا تاکہ وہ صرف اللہ ہی کے محکوم ہوں اور اس کی حکومت میں کسی اور کو شریک نہ کریں۔ وارثین کتاب کی جماعت کا فریضہ حیات کیا ہوگا؟ فرمایا

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

"تم وہ بہترین قوم ہو جو تمام نوعِ انسانی کی ہدایت کی خاطر پیدا کی گئی ہو۔ تمہارا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ تم قوانین الٰہیہ کا حکم کرو۔ اور لوگوں کو اس کے خلاف دوسری باتوں سے روکو۔"

تصریحات بالا سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ اسلام کے تین عناصر ترکیبی لاینفک ہیں۔

- اوّل۔ ضابطۂ قوانین الٰہیہ
- دوم۔ قوتِ نافذہ
- سوم۔ ان دونوں کی حامل جماعتِ مومنین یا حزب اللہ

اس قدسی دور کے بعد جس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے۔ قوت نافذہ کس طرح پہلے مسخ اور پھر معدوم ہو گئی۔ یہ داستان بڑی الم انگیز ہے۔ اور اسکا دہرانا بڑا دلخراش۔ لیکن قوت کا مٹ جانا اتنا دردانگیز نہیں جتنا حیات اجتماعیہ کے اسلامی تخیل کا قلب و دماغ سے محو ہو جانا۔ آج حقیقت بیں آنکھیں جب اس محرومی پر نگاہ ڈالتی ہیں تو فرطِ حیرت سے کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں کہ پیکر اسلام کا یہ بنیادی عنصر کس طرح عجمی تصورات کے رنگین پردوں میں چھپ گیا۔ جس کی وجہ سے اسلام اپنے مقام بلند سے اتر کر عام انسانی مذاہب کی طرح انفرادی نجات اور ذاتی تزکیۂ نفس کا ذریعہ بن کے رہ گیا اور یوں مسلمانوں کے رگ و پے میں وہ رہبانیت عملاً

سرایت کر گئی جس کے خلاف اسلام ایک کھلی ہوئی بغاوت تھا۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ اسلام، نفوس کا تزکیہ اور افراد کی اصلاح اس لئے چاہتا ہے کہ کہ ان کے مجموعہ سے جو جماعت تیار ہو وہ از خود اصلاح یافتہ ہو۔ اس کے نزدیک ایک پرزہ خواہ کتنا ہی پختہ اور درست کیوں نہ ہو۔ اگر وہ اکیلا پڑا ہے تو اس کی کوئی قیمت نہیں۔ اس کی قیمت صرف اس وقت ہے جب وہ مشین میں اپنے صحیح مقام پر فٹ ہو اور اس کی ہر حرکت دوسرے پرزوں پر بایں نمط اثر انداز ہو کہ ان تمام پرزوں کی حرکات کا مجموعی نتیجہ گھڑی کے ڈائل کی طرح سامنے آجائے۔ اگر آپ کتاب و سنت اور تاریخ و آثار پر نگاہ ڈالیں تو اس حقیقتِ باہرہ کے ثبوت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت ہی نہ پڑے کہ اسلام نام ہی جماعتی زندگی کا ہے۔ اجتماعی زندگی کے بغیر اسلام کا تصور ہی غلط ہے۔ لہذا ایک دیدۂ بینا کے لئے خون کے آنسو رونے کا مقام وہ نہیں جہاں اسے مسلمانوں کی لٹی ہوئی عظمت اور چھنی ہوئی شوکت کی یاد آئے۔ بلکہ وہ مقام ہے جہاں اسے یہ نظر آئے کہ اسلام جیسا حیاتِ اجتماعیہ کا مذہب کس طرح محض انفرادی اصلاح کا نظریہ تصور کر لیا گیا۔ اسلام کا یہ صحیح تصور صدیوں سے مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ اور اس کے احیاء کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کہ ہماری خوش بختی سے اللہ تعالیٰ نے ہمارے زمانہ میں ایک ایسے مردِ خود آگاہ خدامست کو پیدا کر دیا جس نے اپنی بصیرتِ قرآنی اور جرأتِ ایمانی سے عجمی تصورات کے ان تمام پردوں کو ایک ایک کر کے چاک کر دیا۔ جس سے ان کے نیچے چھپی ہوئی شمعِ نورانی پھر سے انجمن آرا ہو گئی۔ یہ مردِ مومن تھے حکیم الامت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے ۔۔۔ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے ۔۔۔ اقبالؒ

اگر آپ حضرت علامہؒ کے کلام پر اس نگاہ سے غور کریں گے تو آپ پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جائے گی کہ آپ کے پیام کا نقطۂ ماسکہ ہے ملت اور مرکز۔ اور اسلام فی الحقیقت انھی کے التزام کا نام ہے۔ یہ گئے تو اسلام بھی گیا۔

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی ۔۔۔ چھوڑ کر گل کو پریشان کاروانِ بو ہوا
پھر کہیں سے اسکو پیدا کر بڑی دولت ہے یہ ۔۔۔ زندگی کیسی جو دل بیگانۂ پہلو ہوا
آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی ۔۔۔ جب یہ جمعیت گئی دُنیا میں رُسوا تو ہوا ۔۔۔ اقبالؒ

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں — اقبالؒ

یہ تصور کہ ملت کا شیرازہ منتشر ہو چکا ہے، اس کی اجتماعیت فنا ہو چکی ہے۔ ان کی وحدت پارہ پارہ ہو چکی ہے۔ ان کی مرکزیت۔ انفرادیت میں گم ہو چکی ہے حضرت علامہ کو خون کے آنسو رلاتا تھا۔ بحضور رسالت مآبؐ عرض کرتے ہیں ؂

ہنوز ایں چرخِ نیلی کج خرام است — ہنوز ایں کارواں دور از مقام است
ز کارِ بے نظامِ او چہ گویم — تو می دانی کہ ملت بے امام است

وہ مسلمانوں کے منتشر ذرات سے۔ پھر سے ایک ایسی ملت کی تشکیل چاہتے تھے جو تمام اقوام عالم میں سربلند ہو۔ وہ امت جو

میانِ امتاں والا مقام است — کہ آں امت دو گیتی را امام است
نیاساید ز کارِ آفرینش! — کہ خواب و خستگی بر وے حرام است

وہ ملت جس کا اندازِ زندگی یہ ہو کہ

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ او بشاخِ آشیانہ
مہ و انجم گرفتارِ کمندش — بدستِ اوست تقدیرِ زمانہ

وہ ملت جس کی صفات یہ ہونگی کہ

بباغاں عندلیبے خوش صفیرے — براغاں جرّہ بازے زود گیرے
امیرِ او بسلطانی فقیرے — فقیرے او بدرویشی امیرے

ایک زندہ و پائندہ قوم۔ جیتی جاگتی قوم، وہ قوم جس کے اعمالِ صالحہ کے درخشندہ نتائج دیکھ کر دنیا پکار اُٹھے۔ کہ

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں
کمالِ صدق و مروّت ہے زندگی اُنکی — معاف کرتی ہے فطرت بھی اُنکی تقصیریں
قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال — یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

ایسے مسلمان جو ملت اسلامیہ سے اس لئے برگشتہ ہو جاتے ہیں کہ یہ نکبت و ادبار کے نرغہ میں آچکی ہے۔ یہ دورِ انحطاط سے گذر رہی ہے۔ اس میں کوئی جاذبیت نہیں رہی۔ اُنھیں مخاطب کر کے فرماتے ہیں اور سنئے کس دلگداز پیرایہ میں فرماتے ہیں کہ۔

ہمن شاخے کہ زیر سایۂ او پر برآوردی   چو برگش ریخت از وے آشیاں برداشتن ننگ است

ملت اسلامیہ کا وہ شجر مقدس جس کے سایہ میں تم پروان چڑھے۔ تمہارے جیسے بے بال و پر ناتوانوں کو جس نے وہ بازوئے شاہیں عطا کئے کہ جن سے تمہاری بلندئ پرواز کی داستانیں زبان زد خلائق ہوگئیں۔ اگر آج اس درخت پر۔ خود تمہاری ہی بدولت خزاں کا دور آگیا ہے تو اُسے چھوڑ کر کسی اور سرسبز ٹہنی پر جا بسیرا کرنا۔ دنیائے خودداری میں بڑی ہی گری ہوئی بات ہے۔

ملّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ   پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

جب ہم نے یہ دیکھ لیا کہ اسلام نام ہی اجتماعی زندگی کا ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن نامساعد حالات میں ہم گرفتار ہیں۔ کیا اُن کے پیش نظر ہم مایوس ہوجائیں اور سمجھ بیٹھیں کہ اب تو کوئی فرشتہ آسمان سے اُترے تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو سکے۔! یہ خیال بڑا غلط اور حقائق سے چشم پوشی پر مبنی ہوگا۔ اسلام جن تین عناصر خصوصی سے مرکب ہے۔ ان میں سے ایک اور سب سے اہم عنصر ہمارے پاس اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ یعنی ضابطۂ خداوندی جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ ایک ایک حرف اور ایک ایک لفظ کے ساتھ اسی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہے جس میں یہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دیا تھا۔ اس ضابطۂ الٰہی کی موجودگی میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، دوسری قومیں اس لئے گر کر اُبھر نہ سکیں کہ ان سے ہدایتِ خداوندی گم ہوچکی تھی۔ ہماری حالت ان سے اس باب میں مختلف ہے۔ جس حالت میں ہم آج گرفتار ہیں قرآن کریم اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ وراثتِ کتاب کی وہ آیہ جلیلہ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پوری آیت یوں ہے۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا
فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ
سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۳۵/۳۲

پھر ہم نے وراثتِ کتاب کے لئے اپنے بندوں میں سے (ایک جماعت کو)

منتخب کر لیا۔ (ان کے تین مدارج ہو گئے) ایک اپنے آپ پر ظلم
کرنے والے۔ ایک درمیانی روشن والے۔ اور ایک اللہ کے
حکم سے نیکیوں میں سبقت کرنے والے۔

یہ ظَالِمٌ لِّنَفۡسِہٖ کا درجہ وہی ہے۔ جس سے ہم آج گذر رہے ہیں تو کیا وہ لوگ جو اپنے آپ پر ظلم کر لیتے ہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہو جاتے ہیں؟ کیا وہ زندگی سے ابدی طور پر محروم کر دیئے جاتے ہیں؟ کیا ان کے لئے مایوسیوں کی ظلمت ناک گھٹاؤں میں امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہتی؟ قرآن سے تو ایسا مایوس کن جواب نہیں ملتا۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو اس کا نتیجہ یہی برآمد ہوا کہ ہم اس جنّت ارضی سے نکال دیئے گئے۔ جو ایمان و اعمالِ صالحہ کا فطری نتیجہ تھی۔ اس کیفیت کو قرآنِ کریم قصّہ آدم میں اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتا ہے۔ آدمؑ اپنی لغزش کی وجہ سے جنّت کے مقامِ بلند سے نیچے گرا دیئے گئے۔ جب انھیں اس پستی کا احساس ہوا تو عرض کیا۔ کہ

رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا
لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ؕ

اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اگر تو ہماری
لغزشوں کی پردہ پوشی نہ کرے گا تو ہم خاسر و نامراد رہ
جائیں گے۔

یہ وہی "اپنے آپ پر ظلم کرنا" ہے جس کا ذکر ابھی ابھی آیۂ وراثتِ کتاب میں کیا جا چکا ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ ہاں! یہ چھنی ہوئی جنت دوبارہ مل سکتی ہے اور اس کی بازیابی کا طریقہ یہ ہے۔ کہ

فَاِمَّا يَاۡتِيَنَّكُمۡ مِّنِّىۡ هُدًى فَمَنۡ تَبِعَ هُدَاىَ
فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ؕ

جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت آئے۔ تو جو

کوئی اس ہدایت کی اتباع کرے گا اُنھیں کسی قسم کا خوف و
حزن نہیں ہوگا۔

یہ ہدایت آج ہمارے پاس موجود ہے۔ اس لئے ہم اس جہنم کی پستی سے اُبھر کر پھر اُسی جنت کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں سے ہم گرے تھے۔ آدم کی لغزش ابلیس کی لغزش نہیں ہے۔ جس میں گر کر پھر اُبھرنا نہیں، ٹوٹ کر پھر بننا نہیں۔ ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اس کی سزا بھگت رہے ہیں۔ لیکن

آخر گنہگار ہیں کافر نہیں ہیں ہم

ہم سے آدم کا سا سلوک کیا جائے گا۔ ابلیس کا سا نہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہلاک کر کے اس کتابِ خداوندی کو ان اقوام کے حوالہ کر دیا جائے گا جو تمرد و سرکشی کے طاغوتی جرائم کی پاداش میں عملاً جہنم کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی لپیٹ میں آچکی ہیں؟ میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔

جب ابدی مایوسی نہیں تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس فردوسِ گم گشتہ کی کی بازیابی کی کیا سبیل ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کا جواب بھی کچھ مشکل نہیں، جیساکہ ابھی ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہماری نشاۃ ثانیہ کے دو اجزاٗ لاینفک ہیں۔ قرآنِ کریم سے تمسک اور جماعتی زندگی کے تخیل کا احیاء قرآنِ کریم ہمارے پاس موجود ہے لیکن ہماری عملی زندگی میں اس کا حصّہ کچھ اتنا ہی رہ گیا ہے۔ کہ

از یسین او آساں بمیری — اقبالؒ

حالانکہ خدائے زندہ کی یہ کتاب زندہ یکسر زندگی بخش ہے۔ ایسا ضابطہ قوانین ہے جس کا ایک ایک لفظ سرتا پاحق و یقین ہے۔ وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ۔ جس میں کہیں کسی جگہ شک و شبہ اور قیاس و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں۔ لَا رَيْبَ فِيْهِ ایسا حق کہ باطل اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ حق کہتے ہی اُسے ہیں جو ثابت ہو۔ اٹل ہو۔ امٹ ہو۔ اپنی جگہ پر قایم ہو۔ حقیقت کے ہر معیار پر پورا اترے۔ علم و بصیرت کی ہر کسوٹی پر کھرا ثابت ہو۔ اور اس کے برعکس باطل وہ جو مٹ جانے والا ہو۔ جو باقی نہ رہ سکے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ حق ہے۔ باطل کا اسمیں کوئی دخل نہیں۔ علم و دانش ہے۔ توہم پرستی کا اس میں کوئی شائبہ نہیں۔ کسی خاص قوم اور خاص جماعت کی ہدایت کے لئے نہیں۔

بلکہ نسلی - لسانی - طبقاتی - وطنی - قبائلی غرضیکہ تمام غیر فطری حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے لئے یکساں طور پر آئینِ حیات ہے - عدالتِ خداوندی کے میز پر آج قرآن کے علاوہ اور کوئی ضابطہ نہیں جس کے مطابق اقوامِ عالم کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہوں - پھر جس طرح یہ صحیفۂ فطرت مکانی حدود سے بلند ہے - اسی طرح زمانی قیود سے بھی ناآشنا ہے - یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں بھی یہ کہدے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی - اسی طرح قرآنِ کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا - اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو -

صد جہانِ تازہ در آیات اوست عصر ہا پیچیدہ در آنات اوست اقبالؒ

قرآنِ کریم کی آیات کو کھولتے جائیے - جہاں اندر جہاں - زمانہ در زمانہ - ان کے پیچ و خم میں لپٹا ملے گا - فطرت کی کسی چیز کو لیجئے - مثلاً پانی کے متعلق ابتدائی انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھائی جا سکتی ہے - یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس سے نہایا جا سکتا ہے - لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم - تجربہ و مشاہدہ کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں - آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں - ابتدائی زمانہ میں بھی یہ خصوصیتیں پانی کے اندر موجود تھیں اور آج بھی یہ نہیں کہا جا سکتا - کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ ہیں وہ سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں - اس فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی آج اس میں ایتھر کی لہروں نے ایک نئی دنیا آباد کر دی ہے - ایتھر تو پہلے بھی موجود تھا - اسی خلا میں لپٹا ہوا اس انتظار میں تھا کہ انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہوتے ہوئے اسے آن چھوئے اور وہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالہ کر دے - یہی حالت قرآن کریم کی ہے - زمانہ علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتا چلا جائے - قرآن کریم اس سے بھی دس قدم آگے نظر آئے گا کہ یہ اس خدا کی کتاب ہے - جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں - پھر قرآنِ کریم محض چند نظری عقیدوں کا مجموعہ نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ضابطۂ قوانین ہے - مذہب سیاست

تمدن - تہذیب - معاشرت - معاشیات - غرضیکہ دین و دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کے متعلق اس کے اندر اصولِ ہدایت موجود نہ ہوں - وہ اصولِ ہدایت جن پر عمل کرکے ایک اونٹ چرانے والی کھجوروں کی گٹھلیوں پر گذارا کرنے والی قوم دیکھتے ہی دیکھتے ایک طرف قیصر و کسریٰ کی دولت و سلطنت کی وارث بن گئی - اور دوسری طرف دنیائے جہانداری و جہاں بانی میں مکارمِ اخلاق کے اس مقامِ بلند تک پہنچ گئی جسے چشمِ فلک نے ایک مرتبہ دیکھا ہے - اور دوبارہ دیکھنے کے لئے آج تک سرگرداں ہے - قرآن کریم کے متعلق میں نے جو کچھ کہا ہے محض خوش عقیدگی کی بناء پر نہیں کہا - بلکہ بتوفیق ایزدی علےٰ وجہ البصیرت کہا ہے - آج کے مسلمان نے بہت کم سمجھا ہے - کہ قرآن ہے کیا !

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　　　این کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　　جاں چو دیگر شد - جہاں دیگر شود　　اقبالؒ

لہذا آج ہمارے لئے سب سے پہلا مرحلہ قرآن کریم کو اپنی عملی زندگی میں راہ نما بنانا ہے - اور دوسری چیز جماعتی زندگی کا تخیل ہے ان دونوں کے امتزاج (یعنی ایمان و اعمالِ صالحہ) کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا - لیکن یہ کیفیت ایک دن میں پیدا نہیں ہو سکتی - آدمؑ کو دوبارہ جنت حاصل کرنے کے لئے جن تدریجی مراحل سے گذرنا پڑا ہے - انھیں منازل کو ہمیں بھی طے کرنا ہوگا - ہم پہلی ہی جست میں اس مقامِ بلند تک نہیں پہنچ سکتے - اس میں شبہ نہیں کہ انقلابات زمانہ کی برق رفتاری کو دیکھتے ہوئے جی یہی چاہتا ہے کہ کسی طرح ہم میں یہ تبدیلی آج ہی پیدا ہو جائے - ہم رات کو موجودہ حالت میں سوئیں اور صبح اٹھیں تو گرد و پیش عہد فاروقی کا ماحول گھر بار ہو - یہ آرزوئیں بڑی مقدس ہیں لیکن ان کا تعلق عملی دنیا سے زیادہ عالم تصورات سے ہے - آپ کی بیتابی تمنّا بجا اور درست - لیکن عملی دنیا میں آپ کو ان تمام ارتقائی کیفیات سے لذّت آشنا ہونا پڑے گا - جو قطرہ پر گُہر بننے تک گذرتی ہیں - ایک قدسی النفس رسول کے زیر تربیت تو یہ ممکن ہے کہ انسانیت بجلیوں کے کندھے پر سوار ہو کر ارتقائی منازل طے کرتی جائے - لیکن جب ہماری اصلاح خود ہمارے ہی ہاتھوں اور ہم میں سے منتخب اربابِ قلب و دماغ کے ذریعے ہوتی ہے تو قرآنی معیار کے مطابق اصلاح کی آخری منزل تو بتدریج ہی آئے گی - ہماری اصلاح کے ابتدائی مراحل تو ایسے

غیر محسوس ہونگے۔ کہ بظاہر ان میں اصلاح کا شائبہ بمشکل نظر آئے گا۔ لیکن اگر ہم یہ خیال کرکے کہ اصلاح تو دور ہی قابلِ اعتنا ہے۔ جس میں پہلا قدم آخری زینہ پر ہو۔ زینہ چھوڑ کر بیٹھ جائیں تو اس سے ہم اپنی موجودہ سطح سے ایک انچ بھی اُوپر نہیں اُٹھ سکیں گے۔ لہذا آج جو قدم مسلمانوں میں انفرادی زندگی کی بجائے اجتماعی زندگی پیدا کرنے کے لئے اُٹھے مبارک ہے۔ اور اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کا ساتھ دینا باعثِ سعادت اور یوں ساتھ رہ کر اصلاح دارشاد کے پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا موجبِ رحمت۔ اگر مسلمانوں نے آج اس نکتہ کو سمجھ لیا اور اسپر عمل پیرا ہو گئے تو رفتہ رفتہ اُن کی لٹی ہوئی ثروتیں چھنی ہوئی دولتیں اور مٹی ہوئی عظمتیں ایک ایک کرکے ان سے ہم کنار ہو جائیں گی۔ اور دنیا پھر ایکبار دیکھ لیگی۔ کہ

فروغ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ ما گردوں شود روزے اقبالؒ

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلہ

طلوعِ اسلام

جو بیادگارِ حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ مئی ۱۹۳۸ء سے پابندیٔ وقت سے شائع ہو رہا ہے اور جس میں سیاستِ حاضرہ کے تمام اہم مسائل کے متعلق کتاب و سنت اور حضرت علامہؒ کے پیغام کی روشنی میں نہایت بلند پایہ مضامین شائع ہوتے ہیں ان مضامین کی اہمیت کا اس سے اندازہ فرمائیے کہ انھیں الگ پمفلٹوں کی شکل میں شائع کرنا پڑتا ہے اور ہر پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم ہوتا ہے سیاسیات کے علاوہ نظامِ اسلامی کے دیگر شعبوں کے متعلق بھی نہایت جامع مضامین شائع ہوتے ہیں ایک کارڈ لکھکر نمونہ کا پرچہ اور پمفلٹوں کا تعارفی منشور حاصل کیجئے۔

بدل اشتراک — سالانہ پانچ روپیہ —/۵
ششماہی تین روپیہ —/۳
قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ —/۸

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
شمیم منزل شیدی پورہ (قرول باغ دہلی)